ٹوٹ جانے کا رشتہ تھا۔شاہدہ کے والدین نمائشی زیبائشی آرائشی قسم کے امیر لوگ تھے میں بھی ساندہ کلاں سے کھسکتا کھسکایا ڈیفنس تک آپہنچا تھا لیکن مجھ میں ابھی کوخوبو کے اعتبار سے گفتگو کے لحاظ سے معیار زندگی کے حساب سے اصغری کی وجہ سے ایک آنچ کی کس رہ گئی تھی۔میری سوچ غریبانہ انداز زیست فقیرانہ اور جملہ حالات عاجزانہ تھے۔اصغری چونکہ میری دادی کی پسند تھی۔اس لیے وہ بھی فقط رنگ وروغن تک ہی پرکھ پائی۔رنگ محل کی خوبصورت اصغری میں بیگماتی انداز کی کمی تھی اس کے ساتھ رہنا آسان لیکن محفل میں اسے پیش کرنا مشکل تھا۔جہانگیر اور شاہدہ کچھ دیر ہمارے ساتھ رہے لیکن پہلے بچے کی پیدائش کے کچھ عرصے بعد شاہدہ اپنے باپ کے گھر شفٹ ہوگئی ۔کچھ عرصی تو جہانگیر رویت نبھاتا رہا کبھی دن کبھی رات ہم بڈھوں کے ساتھ گذارنے کے لیے آجاتا لیکن اس غیر حاضری کے لئے اسے شاہدہ کے حضور کئی بہانے بنانے پڑتے۔پھر وہ بھی ڈوری سمانے بچے اور شاہدہ کی پتنگ سے بندھا ہم سے رخصت ہوگیا۔۔۔۔۔

جہانگیر کو جلد ہی اس کے سسر نے اپنی فیکٹری میں فٹ کرلیا اور اس طرح امریکہ آنے سے بہت پہلے وہ ہمارے گھریلو سسٹم کا حصہ نہ رہا۔شہادہ کو امریکہ جانے کی کوئی ضرورت نہ تھی اسے ہر قسم کی آسایش میس تھی لیکن ارجمند اور بلال جب رخصت ہوئے تھے۔شاہدہ نے امریکہ کو اپنے لیے چیلنج بنالیا ارجمند اور بلال کے لیے امریکہ ایک مجبوری تھی۔وہ پاکستان میں اپنے لیے ناکافی دولت اور عزت کما کر عاجز آگئے تھے۔جہانگیر کے لیے ایسا کوئی مسئلہ نہ تھا وہ اپنے سسر کی ایک بہت بڑی ٹیکسٹائل مل کا جنرل منیجر تھا۔پھر بھی وہ لاہور چھوڑ کر نئی دنیا چمک دمک دیکھنے کے لیے رخصت ہوگیا۔

ارجمند اور بلال کو ہجرم کیے ابھی زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا جبکہ جہانگیر اور شاہدہ بھی پردیسی ہوئے۔۔۔۔اصغری نے بیٹی کی جدائی تو سہہ لی لیکن بیٹے کے جانے کے

بعد وہ بالکل بیکار ہو گئی۔

عورت بڑھاپے میں اگر پرورش کے چکر مین نپ پڑے تو بیماری کے چکر میں پڑ جاتی ہے اس کے اردگرد بچت پوتے پوتیان نواسے نواسیاں ہر عمر اور طبقے کے رشتہ دار گھرا ڈالے رکھیں تو وہ خوش رہتی ہے۔ ہر قسم کا صدری نسخہ، ٹونا ٹوٹکا۔ کھانے پکانے کی ترکیبیں، رنگائی دھلائی کی باریکیاں، رشتوں کی چھان پھٹک اسے نوجوان عورتوں میں ممتاز کر دیتی ہیں بڑھاپا عورت کا سنہری دور ہوتا ہے بڈھا اس سے خوفزدہ اور نوجوان اس کے دبدبے سے خائف ہوتے ہیں اس میں سرداری تھانیداری اور جی داری کے وصف پیدا ہو جاتے ہین، لیکن اب زمانہ بدل گیا تھا۔ بہوئیں پوت لے کر چمپت ہو جاتیں۔ رشتہ دار امیر ہونے بعد مشورے مانگنے میں اپنی تک محسوس کرتے کھانے پکانے کی جو ترکیبیں درکار تھیں ان کا نام بھی بڑھیاں نہ سنا تھا۔ نہاری سموسے، پلاؤ، شامی کباب اور ایسے ہی گھریلو پکوان آؤٹ ہو چکے تھے ڈائیٹنگ کرنے والی لڑکیاں اب مغربہ کھانوں پر سوئچ آن کر چکی تھیں۔

چینی کھانا ان تھا۔ کپڑوں کے لیے ماڈلز اور بوتیکوں کی طرف رجوع تھا۔ ڈایزائنر کپڑوں کی تلاش جاری رہتی تھی۔ اس لیے بڑی عورتیں گھٹنوں کے درد زیابطیس اور بلڈ پریشر کے چکروں میں کھو گئی تھیں اب موئے ڈاکٹر ہی ان کی باتیں سنتے اور ان کو مشورے دیتے۔ باقی جاندان دوست بچے ترقی کی ہوا اڑا لے گئی تھی

اصغری ساری عمر ماں رہی۔

وہ نہ صرف اپنے بچوں کی ماں تھی بلکہ مجھے بھی اس نے اپنی مامتا کی چادر میں لپیٹ لیا تھا۔ اسی مامتا کی وجہ سے اس کے ساتھ رہنا آسان تھا۔ اس میں کسی قسم کا چیلنج، مقابلہ بدتمیزی، گستاخی نہ تھی جب ارجمند اور جہانگیر اپنے اپنے دائروں مین گومتے امریکہ بدر ہو گئے تو ماں کا جینا دوبھر ہو گیا۔ پہلے اس نے ملازموں کو بچے بنایا۔ پھر ایک

جنگلی بلی کو سدھا سدھا کر اپنے پوؤں میں لوٹنا سیکھا دیا۔ ان سے بھی دل نہ بھرا تو سارے گھر میں ان ڈور پودے لگا کر اس نے اماں حوا کا باغ بنا دیا رہی سہی کسر اصغری مجھ پر نکالتی رہی۔ وہ میری آیا، نرس، سیکریٹری، پڑوسن دوست ماں سب کچھ تھی ان سارے آرام دہ رشتوں میں کوئی کانٹا، چبھن سوزش نہ تھی وہ کسی میں بے کلی کو جنم دینے یا ابھارنے کے قابل نہ تھی۔

اصغری صرف ماں تھی ۔۔۔۔ماں اردگرد پرورش کا بکھڑا نہ ہو تو وہ بن پانی کے جھاڑ کی طرح پہلے کملاتی ہے پھر زرد ہو کر جان چھوڑ دیتی ہے ۔۔۔۔جہنگیر امریکہ سدھارا۔ پہلے تو وہ اس کا انتظار کرتی رہی ۔گرین کارڈ بن جانے کے باوجود جب وہ ماں سے ملنے نہ آیا یا نہ آسکا تو وہ حیران رہ گئی ۔پھر سال دو سال وہ جہانگیر کے پاس جانے کا ارادہ کرتی رہی ۔۔۔آخر میں اس نے زندگی کے دم دلاسہ کا جواء گلے سے اتارا اور چپ چاپ رخصت ہو گئی ۔

اسے شاید معلوم نہیں تھا کہ کہ میں اس کا اسہ طرح عادی تھا جیسے گود کا بچہ چوسنی کا رسیا ہوتا ہے، بڑی دیر میں، خالی کمروں میں اصغری کو تلاش کرت رہا ۔پھر مین نے ایک دن گلاس سے دودھ پینا شروع کر دیا ۔۔۔۔یہ گلاس میر ملازم غلام نبی تھا

ہاں تو میں آپ سے اصغری کی بات کر رہا تھا ۔ہر عورت میں ماں اور طوائف کا امتزاج ہوتا ہے ۔۔۔۔جب عورت خدمت گزار ایثار پسند ،تخلیق کار وجدان کی خوبیاں سے متصف ہوتی ہے اس وقت اس میں ماں پن واضح ہو جاتا ہے جو نہ اس میں طوائف پن ابھرتا ہے وہ ذات کے حوالے سے خودغرض سوچ میں رنگی جاتی ہے اب اس عورت پن یا Self ابھرتا ہے۔ وہ اپنے وجود کی نمایش کے لیے کوشاں ہو جاتی ہے۔ وہ کیا پہنتی کیسا کھاتی اور کسمعیار زندگی مین دن بسر کرتی ہے اس کے لیے یہ چیزیں اہم ہو جاتی ہیں اس کا ہر سوال اس کی اپنی ذات سے نکلتا ہے اور کا جواب اس کی اپنی ذات کو درکار ہوتا ہے۔

جس طرح عورت ماں اور طوائف کا ملغوبہ ہے ۔ ہر مرد میں بھی ایک کارندہ کفالت کرنے والا اور ایک زنا کار موجود ہوتا ہے۔ کفیل زندگی کو دماغ کے بائیں حصے سے پرکھنے کا عادی ہوتا ہے وہ عقلی روشنی میں استخراجی احتیاطی خارجی عملی اور تجویزی زندگی بسر کرتا ہے لیکن مرد Rapist ایک اور نہج کا آدمی ہوتا اور کہلاتا ہے، جونہی ماں اور کفیل سنجوگ مین بندھ جاتے ہیں کامیاب شادی شدہ زندگی جنم لیتی ہے ۔طوائف اورانا کارمل بیٹھیں تو ہی ہی ہاہا موج میلا ٹھٹھا مذاق جنم لیتا ہے مشکل یہ ہے کہ کوئی عورت یا کوئی مرد سو فیصد اپنا ایک روپ قائم نہیں رکھ سکتا ۔ کسی عورت میں سیر بھر عورت اور پاؤ بھر ماں ہوتی ہے کوئی پچاس پچاس فی صد دونوں رنگ رکھتی ہے مرد مین بھی دونوں روپ ملے جلے ہوتے ہیں خود نہ مرد کو علم ہوتا ہے نہ عورت کو کہ اس کے اصلی روپ پر کس وقت دوسرا ہمزاد شب وخون مارے گا اور حاوی ہو جائے گا۔ عمر موسم میل جول غریبی امیری اتنے فیکٹرز اس پر اثر انداز ہوتے ہیں کہ بالآخر کہنا پڑتا ہے کہ جب تک انسان زندہ ہے خطرہ موجود ہے اور وہ کسی وقت بھی روپ بدل سکتا ہے ۔

لیکن مین آپ کو اصغری کے متعلق وثوق سے بتا سکتا ہوں کہ وہ پوری پوری ماں تھی اگر اس میں کہیں عورت پن موجود تھا تو اس روپ کو اس نے اپنے خیالوں سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں دی ۔۔۔۔۔ اپنے خیالوں میں نہ جانے اس نے کیسی پینگیں چڑھائیں کیسی کیسی عیاشی کی ۔خیال کی مینے گلرنگ سے مین نے اس کا چہرہ بھی کبھی تمتمایا ہوا نہ دیکا ۔میرا خیال ہے اصغری کے جینز ترقی کرنا نہیں جانتے تھے ۔وہ پچھتوں کی تربیت کا نچوڑ تھی ۔وہ جھگڑے اور فساد سے ناآشنا اس دارالحزن میں آئی اور کسی قسم کی ترغیب دلائے بغیر کسی سیب کے درخت کو چھیڑے بنا ہی رخصت ہوگئی اس کے بعد میری زندگی خالی کوکا کولا کی بوتل تھی ۔

اصغری کی اصل کو مین پہنچان نہ سکا اور اقبال کے متعلق میرا علم اتنا ناقص اور

معلومات اس قدر کم تھیں کہ میں فقط اپنے جذبے کی روشنی میں اس کی دھندلی یادوں کو سمجھنے کی کوشش میں مبتلا رہا۔ لیٹے لیٹے مجھے ایک کہانی یاد آ گئی جو کچھ یوں تھی

یمن کے بادشاہ نے اپنے وزیر باتدبیر کو اپنی خوابگاہ میں طلب کیا اور گویا ہوا۔۔۔۔۔۔ "اے وزیر میں رات بھر میں بے خواب رہا مجھے اصل اور نقل میں پہچان نہیں۔ میں ادل بدل کو سمجھتا نہیں۔ انسان میں تبدیلی کو جانتا نہیں پھر مجھ پر یہ تاج شاہی کیوں؟"

وزیر اعلیٰ تدبر کورنش بجا لایا اور اختصار سے بولا۔۔۔۔ "ظل الہٰ! کچھ اپنی پریشانی کی وضاحت فرمائیں تو ناچیز کچھ عرض کرے۔"

بادشاہ نامطمئن لہجے میں گویا ہوا "میں آج تک کسی انسان کو سمجھ نہیں پایا۔ جب کسی کو باوفا سمجھ بیٹھتا ہوں تو وہ بےوفا ہو کر دشمن سے جا ملتا ہے جب کسی پر احسان کی گٹھڑی لادتا ہوں تو وہ احسان فراموش نکلتا ہے۔۔۔۔"

"اس لیے آقا کہ انسان آگ اور پانی سے بنا ہے اور نغادے سے متصف ہے۔ وہ جب بھی ایک اصلیت کو زیر دام لائے گا۔ کچھ مدت بعد اس کی دوئی دوسرا رنگ برآمد کر دے گی۔۔۔۔"

دیر تک بادشاہ خشمگیں نگاہوں سے وزیر حاضر دماغ کو دیکھتا رہا وہ پہلے سے بھی زیادہ الجھتا جا رہا تھا آخر کار بولا۔۔۔۔۔۔ اس میں تجھ سے انسان کی دوئی کا چرچا نہیں کرتا۔۔۔۔ یہ تو روز ازل کا جھگڑا ہے مجھے تو امور سلطنت کی ایک گتھی سلجھا کر دے۔۔۔"

وزیر نا تواں نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے اور جھک گیا "بسر و چشم آقا"

بادشاہ نے اپنے سفید ابروا اٹھا کر استفادہ کیا۔۔۔ "ا یکھ مرد صد صفات ٔ میں پریشان ہوں۔ کیا میں اپنی رعایا کے علم میں اضافہ کروں یا صرف ان کی ضروریات کا

خیال رکھوں ارصرف ۔۔۔ان کو نان نفقہ پہنچا کر سبکدوش ہو جاؤں ۔۔۔۔۔۔"

کچھ دیر وزیر خاموش رہا پھر روز افشاں کرنے کے انداز میں بولا "دیکھ شاہ والا تبار! ان لوگوں کو علم عطا کرنا جس سے یہ مستفید نہ ہو سکیں ۔بے معنی ہے ایسے لوگوں کو روٹی عطا کرنا جو آپ کی نیت سے نا آشنا ہیں مہمل عمل ہے ۔دونوں حالتوں میں رعایا کے نفع کی توقع رکھنا بیکار ہے گدھے پر علم کا وزن ڈالنا اور جو کھانا کھا کر بدگمانی کا شکار ہو یہ بھی عمل رائیگاں ہے"

"میں تیرا مطلب سمجھا نہیں ۔۔۔۔۔"

"رعایا میں ملے جلے لوگ ہوتے ہیں شاہ جم جاہ ۔۔۔کچھ سمجھتے ہیں کہ بادشاہ نے جو خزانے کے منہ کھول رکھے ہیں تو دراصل یہ رشوت کی ایک قسم ہے آگے چل کر بادشاہ ہن سے ضرور کچھ ایسے بھیانک کام کروائے گا جو ہماری مرضی کے خلاف ہوں گے ۔اس لیے بدگمان کھائے جاتا ہے لیکن احسان مند نہیں ہوتا ۔"

بادشاہ مضطرب ہو کر بولا ۔۔۔"تو بول پھر میں اپنی رعایا کے لیے کیا کروں ؟" کچھ دیر بعد وزیر خاموش رہا پھر رسان سے گویا ہوا ۔۔"ایک بات دھیان میں جمی رہے تو صاحب اقتدار صحیح راہ پر چل سکتا ہے ۔بسا اوقات جسے آپ ناکارہ سمجھ کر برطرف کیے رکھتے ہیں وہی کام آمد و قیمتی ثابت ہوتا ہے ۔۔۔۔۔"

"میں تیری بات سمجھا نہیں ۔۔۔۔"

وزیر نے آنکھیں گھما کر کہا ۔۔۔"افغانستان سے ایک صوفی درویش حال ہی میں شہر میں وارد ہوا ہے ۔۔۔صاحب حال ہے ۔اجازت ہو تو اس گتھی کو اس کے سپرد کیا جائے ؟"

بادشاہ نے اجازت مرحمت فرمائی ۔

افغانستان کا درویش حاضر ہوا ۔۔۔سر سے پاؤں تک برف کا گالا حسن و خوبی

کی زندہ مثال، مسکراتا تو روشنی میں اضافہ ہو جاتا سوچتا تو ماحول تفکر میں ڈوب جاتا سیانے وزیر نے دست بستہ عرض کی۔۔۔۔"سرکار! اگر اپنے افغانستان میں آپ صاحب اقتدار ہوتے تو وہاں رعایا کا حق کیسے ادا کرتے۔ان کا کارساز کیوں کر بن کر دکھاتے؟"

افغانی درویش نے کہا۔۔۔۔"اے عالی مرتب وزیر۔۔۔۔ایک تجربہ کرنے کی ضرورت ہوگی۔۔۔۔اگر کوئی شخص کسی ضرورت مند کو آدھ سیر خوبانی نہایت عمدہ عنایت کر دے اور دینے والے کو بتائے کہ اس عمل سے اسے زمانے بھر کی دولت نصیب ہوگی اور عنایت کرنے والا مان جائے تو یقین رکھ، اس بادشاہ کی سلطنت میں لہر بہر ہوگی اور فلاح کا راستہ بھی کھل جائے گا۔"

چندے توقف کے بعد بادشاہ نے کہا۔۔۔۔"یہ کیوں کر ممکن ہے کہ آدھ سیر خوبانی ایک سلطنت کا پانسہ پلٹ دے۔"بادشاہ کا تذبذب دیکھ کر فقیر بولا ۔۔۔۔۔۔"چل پھر میرے ساتھ چل۔۔۔۔تجربہ شرط ہے۔میں تجھے بازار کابل کی سیر کرواؤں۔۔۔۔"

بادشاہ اور وزیر نے عام لوگوں کا بھیس زیب تن کیا اور افغانی درویش کے ہمراہ سدھارے۔لمبی مسافتیں طے کر کے کابل کے بازار میں پہنچے۔ایک امیر کبیر پھل فروش سے سامنا ہوا۔درویش نے دست سوال پھیلایا اور ملتجی ہوا۔۔۔۔"اے پھل فروش! ایک بہت ہی غریب آدمی لذیذ خوبانی کی آرزو رکھتا ہے۔تو مجھے آدھ کلو خوبانی بطور خیرات عطا کر کہ میں اس کی دیرینہ خواہش پوری کروں۔۔۔۔"

پھل فروش نے قہقہہ بلند کیا۔۔۔۔"واہ میں نے ان گنت فقیر دیکھے لیکن آج تک خیرات میں خوبانیاں مانگتے کسی کو نہ پایا۔تم جیسے ٹھگوں کو میں خوب پہچانتا ہوں رستہ ناپو۔"

تینوں کچھ فاصلے پر جا رکے تو درویش بولا۔۔۔۔"اے بادشاہ یہ شخص سارے

بازار میں اپنی دولت کے باعث عزت وتوقیر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، لیکن میرے نزدیک ناکارہ۔ اس کی جانب مت دیکھ کہ یہ اپنے لیے جنت کا سودا بھی نہ کر سکا۔ ملک کی خوشحالی کا باعث کیوں کر ہو جاتا؟''

گھومتے پھرتے، ٹہلتے وہ دریائے کابل کے پل پر پہنچے۔ یہاں وزیر با تدبیر اور درویش نے مل کر بادشاہ سلامت کو دریا میں دھکا دے دیا۔ حسن اتفاق ملاحظہ ہو بادشاہ پیراکی کے فن سے نا آشنا تھا غوطے کھانے لگا۔ جان بلب ہوا۔ پل کے کنارے کا کا دیوانہ کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ جونہی بادشاہ کو ڈوبتے پایا قہقہے لگاتا روانہ ہو گیا۔۔۔۔ دریں اثنا بہت سے لوگوں نے بادشاہ باوقار کو ڈوبتے دیکھا اس کا واویلا سنا لیکن سب نظر بچا کر اپنی اپنی راہ چل دیئے۔

جب ظل الٰہی کے حواس درست ہوئے تو اس نے اس حرکت کی وجہ دریافت کی۔ درویش نے کہا۔۔۔ ''دیکھ بادشاہ! جب ہم پل پر پہنچے تو میں نے کا کا دیوانہ دیکھا۔ اس جیسا ناکارہ شخص سارے کابل میں نہیں۔ فاتر العقل ہے۔ نہ اپنے بھلے کی سوچ سکتا ہے نہ کسی کی فلاح کا باعث بن سکتا ہے، لیکن لمحہ فکریہ تو یہ ہے کہ بحران کے وقت یہی دیوانہ کارآمد کام آیا۔''

اب جن ضلیل القدر بادشاہ یمن لوٹا تو اس کھوج میں رہنے لگا کہ علم کے طالب کی ضرورت علم کے توسط سے پوری کرے اور فاقوں سے بیزار لوگوں تک ان کا مطلوب پہنچے۔ اس تگ و دو میں بادشاہ راب کو بھیس بدل کر نکلتا اور انسان کی اصلی طلب کی کھوج لگاتا۔ برسوں بھیس بدل کر نکلتے رہنے سے اس کی بصیرت میں اضافہ ہوا۔۔۔۔ لیکن ایک بات سمجھنا اس کے لیے پھر بھی محال رہا کہ ناکارہ کو کیسے کارآمد سمجھے حتیٰ کہ غنیم نے اس پر چڑھائی کی اور شہر کا محاصرہ کر لیا۔۔۔۔ ایک دیوانہ وزیر با تدبیر کے پاس حاضر ہوا۔ کہنے لگا۔۔۔۔ ''دیکھ راتوں رات ساری فوج کو قریبی دریا میں چھپا دے۔ جب دشمن کو یقین ہو جائے کہ خطرہ نہیں فوج دریا سے نکل کر قلعے پر حملہ کر

دے دشمن کو شکست دے"۔۔۔۔۔وزیر نے ایسا ہی کیا اور دشمن کو قرار واقعی سزا دی
۔سنا ہے اسی دن کے بعد سے بادشاہ نے کسی بھی انسان کو حقیر سمجھنا اپنی شان کے
خلاف سمجھا اور درجہ بدرجہ لوگوں کی فلاح میں مشغول رہا۔اس کی مملکت میں ضرورت
مند علم والے اور ناکارہ سبھی نے فلاح پائی۔

فون کی گھنٹی بجی۔۔۔۔بھاگ کر قیصر نے فون اٹھایا۔

"نانا۔۔۔۔یہ فون آپ کے لیے ہے"اس نے مجھے امریکن لہجے میں
پکارا۔میں نے چونگا قیصر سے پکڑا۔چھوٹا سا فرشتہ مسکرایا اور بولا۔۔۔۔"جہانگیر
ماموں فون پر ہیں"

"کیا حال ہے جہانگیر۔۔۔۔"میں نے سوال کیا۔

"آپ نے ارجمند کے پاس ہی رہنا ہے۔میرے پاس نہیں آنا۔۔۔۔۔"

میں نے احساس جرم تلے کھانس کر کہا۔۔۔۔"ابھی تو ارجمند جاپان گئی ہے
واپسی پر کچھ پتہ چلے گا"

دوسری جانب جہانگیر کی آواز پر امید تھی۔وہ خوشخبری کی آواز میں بولا ابو ہم
آجاتے ہیں آپ کے پاس۔۔۔آپ ٹریول نہ کریں۔۔۔آپ کے لیے مشکل ہوگا"

"ہاں وہ بھی ہوسکتا ہے بلکہ تم ہی آجاؤ۔۔۔۔"

مشکل یہ ہے ابو جی کہ۔۔۔۔میں نے ابھی جو جاب لی ہے اس کا پروبیشن پیریڈ
ہے۔میں ابھی چھٹی نہیں لے سکتا۔۔۔۔۔یہ شاہدہ آپ سے بات کرنا چاہتی ہے ابو
"اُس نے فون شاہدہ کو پکڑا دیا۔

"ضرور ضرور۔۔۔۔"

"اسلام وعلیکم ابو جی۔۔۔۔۔"

"وعلیکم السلام"

"کیا حال ہے ابو جی۔۔۔۔"

''بالکل ٹھیک ہے۔۔۔۔''

''کچھ دیر کے لیے یہاں ہمارے پاس آجائیں ابو۔۔۔۔۔۔میں ٹکٹ بھجوا دوں؟''

''نہیں نہیں ہرگز نہیں۔۔۔۔میں خود ہارون کو دیکھنا چاہتا تھا۔۔۔کتنا بڑا ہو گیا ہے وہ۔''

''اب تو وہ سکول جانے لگا ہے ابو۔۔۔۔پوری پوری باتیں کرتا ہے''

''ہاں۔۔۔۔'' دل میں ہلکی سی ٹیس اٹھی۔۔۔۔انسان کتنا مجبور ہے!

میں اپنے پوتے کی باتوں سے بھی آشنا ہوں.....؟ میں اپنی اصغری کے سائے سے بھی محروم ہوں اور اب اقبال کی ہلکی پھوار بھی مجھ پر نہیں پڑتی۔

''پھر آ آ جائیں ناں پوتے کو دیکھنے.....''

''ابھی تو بچے اکیلے ہیں۔بلالا اور ارجمند جاپان گئے ہوئے ہیں''

پتہ نہیں کیا بات تھی۔میں جہانگیر کے گھر جانا نہیں چاہتا تھا.....وہاں بھی خالی دن اور خالی راتوں کا ہی سامنا تھا۔

ارجمن کو جاپان سے لوٹے دس بیس دن گزر گئے تھے۔واپسی پر اس نے مجھ سے سرسری طور پر اقبال اور اس کے میاں نثار کے متعلق پوچھا اور نت نت کر کے چپ ہو گئی۔میں کارڈلیس لے کر بیلکونی میں بیٹھا تھا۔جہانگیر کا فون پھر آ گیا۔شاید وہ کسی قسم کے احساس جرم میں مبتلا تھا۔

''ابھی پھر کیا پروگرام ہے آپ کا.....''

''یار میں کچھ سفر سے گھبراتا ہوں.....''

''میں کار میں آپ کو لینے آ جاتا لیکن نہیں ملی ابو.....''

''نہیں نہیں..... تم کہاں مجھے مل وا کی سے لینے آیو گے۔''

''یہاں فاصلے بے معنی ہیں ابو..... امریکن ہوائی جہاز کے مقابلے میں کار کو پسنر کرتا ہے آزاد جو ہوا.....''

پتہ نہیں شاہدہ نے اس سے فون لے لیا یا نہیں پھر جہانگیر نے اسے چونگا پکڑا دیا.....

''ابوالسلام علیکم.....'' بہو جی بولیں۔

''وعلیکم السلام وعلیکم''

فون پر مجھے شاہدہ کی آواز دوستانہ لگی

''آ جائیں ناں ابو..... جہانگیر کبھی کبھی بہت اداس ہو جاتے ہیں۔ لاہور انہیں بھولتا نہیں۔ کار کا سفر لمبا ہے۔ ٹکٹ بھجوا دوں.....''

''کیسے بھولے بیٹا..... لہور لہور ہے'' میں خوش دلی سے اضافہ کرتا ہوں۔

''واپس لوٹنے سے ایک بار پہلے تو ہمارے پاس آ جائیں.....''

میں پچھلی ساری سرد مہریاں بھلا کر جواب دیتا ہوں ''یار میں سفر سے بہت گھبراتا ہوں۔ اتنے لمبے لمبے تو ایئر پورٹ بنا رکھے ہیں تمہارے امریکنوں نے..... چل چل کر آدمی ہف جاتا ہے.....''

''نہیں ابو ضرور آئیں..... ہمارے گھر سے کوئی تین منٹ کے فاصلے پر ایک مسز نثار رہتی ہیں۔ ابو..... وہ آپ کی بہت باتیں کرتی ہیں۔ میری بڑی نند جمیلہ کی سہیلی ہیں۔ کل بتا رہی تھیں کہ آپ بڑے اچھے شاعر ہیں کہ سیدھی سیدھی پڑھتے تھے.....'' میری شاعری کو جاننے والی اس کے علاوہ اور کون تھی؟

یکدم میرا پروگرام بن گیا۔

میں اپنے پوتے کو دیکھنے جا رہا تھا۔

''اچھا یہ بتاؤ ایئر پورٹ گھر سے کتنی دور ہے''

''دس منٹ لگتے ہیں کل''

''بس اس ویک اینڈ پر تمہارے پاس ہوں گا.....''

میں اسے یہ نہ بتا سکا کہ وہ اقبال کو بھی اطلاع کر دے اور ہارون کو بھی۔شام سے پہلے میری جیب میں مل وا کی کا ٹکٹ تھا۔

بلال نے اپنا بریف کیس گاڑی میں رکھا اور مجھے دیکھ کر کہا..... ''ابو جی اس ویک اینڈ پر ہم سب پاکستان ایمبیسی جا رہے ہیں۔انکل نثار آپ سے ملنے کے آرزومن ہیں۔''

مجھے اب واشنگٹن جانے میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔

''اوہ..... میں تو اس ہفتے مل وا کی جا رہا ہوں بیٹے ہارون کو دیکھنے..... ارجمند میرا ٹکٹ بھی لے آئی ہے.....''

''اوہ..... آ کو میں ان کے گھر بھی لے جاتا.....''

میرے لیئے ٹریڈ منسٹر انکل نثار اب کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا۔مجھے یقین ہو گیا تھا کہ مل وا کی میں اصلی اقبال موجود ہے۔

اس کے جانے کے بعد میں نے دو مرتبہ جہانگیر کے گھر فون کیا لیکن گھر پر کوئی موجد نہ تھا۔پھر رات گئے شاہدہ کا فون آ گیا۔

''ابو جی سلام.....''

''وعلیکم.....''

''ابو جی آپ کا پیام ملا تھا مشین answering پر، افسوس ہم لوگ گھر نہیں تھے''

میں نے خوش دلی سے پوچھا ''فوجیں کہاں گئی ہوئی تھیں؟''

''وہ آنٹی اقبال تھیں ناں مسز مثار..... وہ Long Island چلے گئے ہیں، ساتھ ساتھ ہم ان کا سامان پیک کر رہے تھے، ساتھ ساتھ باتیں ہو رہی تھیں۔ وہ رفعت آپا سے بہت چھوٹی تھیں تو دوستی کیسے ہوگئی ابو.....''

''بس کبھی کبھی ایسے بھی ہو جاتا ہے.....'' بھلا اب میں اس چھلاوے کو اور کہاں تلاش کروں؟

''تم نے انہیں بتانا تھا کہ میں شاید آؤں.....''

''یہاں تبدیلی Rule of the Game سے کوئی امریکن ایک ہی جگہ جم کر نہیں بیٹھ رہتا۔ جہانگیر بھی اوہائی یو جانا چاہتے ہیں، بس آنٹی نے ارادہ کیا اور چل دیں۔''

''جی ابو کیوں فون کیا تھا آپ نے.....''

''بس تمہیں یہ بتانا تھا شاہدہ کہ میں آ نہیں سکتا میری طبیعت ٹھیک نہیں.....''

مجھے یوں لگا جیسے شاہدہ دوسری جانب رو پڑی ''آپ ہارون سے ملنے بھی نہیں آ سکتے ابو؟''

پردیس میں یوں بھی ہوتا ہے..... سر بھی اچھا لگنے لگتا ہے..... بہو..... سرے کا بھی انتظار کر سکتی ہے۔

اصغری کی گمشدگی سے جو خلا پیدا ہوا، اس سے گھبرا کر میں باہر کی طرف دوڑتا..... ہم دونوں ایک عرصہ تک ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہوئے بھی الگ الگ رہے تھے لیکن اصغری کے بعد اب گھر کی سے مجھے فاصلے کی رفاقت کی کوئی شعاع نہیں ملتی تھی۔ ایک دن مجھے پنواڑی کی دکان پر عارفین مل گیا۔

ہم دونوں سکول میں اکٹھے رہے تھے۔ نہ ہم پہلے کبھی دانت کاٹی روٹی کھاتے تھے، نہ ہی ہمارے درمیان کوئی خاص رابطہ بن سکا لیکن اصغری کے بعد ماضی سے

رابطہ جڑ گیا اور چونکہ میں مستقبل میں سوائے موت کے اور کسی چیز کو حتمی طور پر بلا نہ سکتا تھا، اس لیئے میں نے عارفین کے روپ میں ماضی کو اپنا لیا۔ بدقسمتی سے اسی مجبوری کی وجہ سے میں عارفین سے مکمل طور پر مات بھی کھا گیا۔

یہ بات نہیں کہ وہ مجھ سے طاقتور تھا یا مالی طور پر وہ مجھ سے بہتر تھا۔ شکل وصورت بھی اس کی واجبی سی تھی۔ وہ ٹوون مقابلے میں وہ مجھ سے کمتر تھا..... وجہ صرف اتنی تھی کہ مجھے اس کی ضرورت تھی اور ضرورت ہمیشہ مجبوری کو جنم دیا کرتی ہے۔ میں اپنے خالی دنوں کو کسی کے نام معنوی کرنا چاہتا تھا۔ عارفین نے مجھے اس لیئے قبول کیا کہ اسے کسی میڈل کی اشد حاجت تھی۔ اس نے مجھے شکست دے کر یہ میڈل اپنے سینے پر سجالیا۔ اس اضافی تمغے نے اس میں عجیب قسم کی خوش اعتمادی پیدا کردی جو شاید اس میں اس سے پہلے نہ تھی۔

کبھی ہم دونوں تاش کھیلتے، کبھی شطرنج کی بازی لگ جاتی۔ کبھی ہم سیر کو نکل جاتے، سارے راستے وہ اپنی بیوی کے رویے کی شکائتیں کرتا رہتا کہ کیسے وہ ساری کی ساری اپنے بچوں میں صرف ہوچکی ہے اور بڑھیا کو علم ہی نہیں کہ عارفین بڈھے کے دن رات، ماہ مہینے، سال بہ سال کن حالوں میں گزر رہے ہیں۔ بڈھا صبح کی بیڈ ٹی سے لے کر رات کو فریج ٹٹولتے رہنے تک خود کفالت کے مختلف مرحلوں سے گزرتا تھا۔ اصغری کی طرح بڑھیا نے ایک مدت سے اپنا بیڈ روم علیحدہ کرلیا تھا اور اپنی خوابگاہ میں وہ اپنے پوتے پوتیوں، نواسے نواسیوں، بہو بیٹیوں کے درمیان مجسٹریٹ، نرس، دایا، آیا، کی حیثیت میں پر بہار زندگی گزارتی تھی۔ اس اہمیت میں گم ہوکر اسے بھول گیا تھا کہ عارفین لمبے وقفوں کے لئے اکیلا ہی وقت کے خلاف ڈنڈ بیٹھکیں نکال رہا تھا۔

میں عارفین کو اپنے متعلق کچھ بتانے کی کوشش کرتا۔ ارجمند اور جہانگیر کی کج ادائی، بے وفائی، کم التفاتی کا ذکر چھیڑتا تو وہ سنی ان سنی کردیتا..... اسے میری

مشکلات کا کوئی اندازہ نہ تھا..... نہ ہی وہ میرے حالات معلوم کرنے میں دلچسپی رکھتا تھا۔

''چھوڑو یار چھوڑو..... بچوں سے آس لگانا چھوڑ دو۔تم اپنی توقعات سے ان کی راہیں کھوٹی کر دو گے..... پہلی بیوی کی طرح رقابت کو زندگی نہ بناؤ..... بڑھاپے کو صرف بڑھیا بھر سکتی ہے۔پہلی مرگئی مرنے دو..... منا جان نہ سہی چنا جان سہی۔کسی طلاقن بڑھیا کا سراغ نکالو اور گھر ڈال لو..... جب تم دوائیاں پینے لگو تو گلاس پانی کا لے کر حاضر ہو جائے۔درد ستائے تو گرم پانی کی بوتل بنا لائے..... فجر کا الارم بجتا چلا جائے تو الارم بند کر دے۔جھینگروں کی آواز ستائے تو پچکاری پھک' چھق کر دے کیڑے مار دوائی ڈال دے۔گھنٹی سن لے۔فون کا جواب دے ڈالے..... چھڑی پکڑائے..... بھائی شادی کر لو کسی بیوہ سے لیکن اس کے بچے نہ ہوں۔تمہاری تنہائی کا اور کوئی علاج نہیں.....'' میری نظروں میں کہیں اقبال آ کر ٹک جاتی اور ہماری سیر اور لمبی ہو جاتی۔مستقبل کو سجانے کے لئے یہی ایک خواب رہ گیا تھا، لیکن مجھے تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اقبال کہاں ہے؟ اور کن حالوں میں جی رہی ہے؟

''تم کو یہ سارے انعامات جو ابھی تم نے گنوائے ہیں، مل رہے ہیں بھابھی زینب سے''

''بتاتا ہوں ناں تمہیں۔زینب تو اب اپنی مجسٹریٹی میں مشغول ہوگئی ہے۔وہ اپنا اقتدار اہمیت چھوڑ کر نہیں آسکتی..... اپنے بیڈ روم سے..... وہ عارفین سے آزاد ہو چکی ہے''

''تو پھر تم دوسری شادی کر لو..... بلکہ بہتر یہی ہے کہ ہم دونوں دو بہنوں سے شادی کر لیں.....'' میں مشورہ دیتا۔

''میرے گھر والے مجھے گھر سے نکال دیں گے یار جی..... وہ سارے کے سارے زینب بڑھیا کے ہاتھ پر بیعت ہیں'' وہ سر ہلا چلا جاتا۔

''تم میری طرف شفٹ کر جاتا..... ڈیفنس کی یہ کوٹھی دو گھرانوں کے لئے بہت بڑی ہے..... تم اوپر رہنا میں نیچے.....''

میرے تخیل کو پر لگ جاتے۔ میں سوچتا شاید اب تک تو اقبال بیوہ ہو چکی ہو گی..... کوئی اس کی کزن وغیرہ بھی آخری عمر کا سہارا چاہتی ہو گی..... ہم بڈھوں سے شادی کرنے پر وہ دونوں رضامند ہو جائیں گی اور جیتے جی باب جنت کھل جائے گا..... نوکروں کے آگے خوشامدی لہجے اختیار کرنے کا موسم، ان کے انتظار کی صعوبت اور نوکروں کو مسلسل بخشیش دیتے رہنے کی مصیبت ختم ہو جائے گی۔ پھر خیال آتا اگر اقبال کے بچے ہوئے اور انہوں نے اڑچن ڈالی تو؟..... میں عارفین سے کبھی اندر کی بات نہ کر سکا۔

ہمیں دونوں بڑھاپے میں دوسری شادی پر دیر تک باتیں کرتے رہتے۔ کئی اسکیمیں بنتیں، فیصلے ہوتے لیکن آخر میں عارفین کہتا..... ''چھوڑ یار..... اس عمر میں کیا جھک ماریں..... ساری عمر بھورا بھورا کر کے عزت جمع کی ہے، ایک ہی ہلے میں سب بہہ جائے گی۔ لوگوں کو کیا معلوم بڈھوں کو بھی مرنے سے پہلے تھوڑی سی ہمدردی، آرام، سہولت درکار ہے؟ ہمیں تو محلے والے، گھر کے لوگ سارے کبھی کامیانی صاحب چھوڑ آئے ہیں۔ اب کیڑے جانیں اور ہم..... منکر نکیر سمجھیں اور ہم سمجھائیں..... چھوڑو یار..... تھوڑا وقت رہ گیا ہے..... اوکھے سوکھے کاٹ لو.....''

عارفین کے ساتھ بھی میرا رشتہ عجیب سا تھا۔ مجھے اس کا ہر وقت انتظار کرنا پڑتا۔ کبھی کبھی تو راہ دیکھنے کا وقفہ اتنا لمبا ہو جاتا کہ مجھے لگتا زندگی کا وقت تھوڑا نہیں بلکہ بہت زیادہ لمبا ہو گیا ہے۔ وہ وعدے کے مطابق کبھی نہ آتا، کبھی میں گیٹ پر کھڑا بار بار گھڑی دیکھتے ہوئے اس کا انتظار کرتا۔ پہلے میرے انتظار میں تلملاہٹ ہوتی، پھر یہ طیش کی شکل اختیار کر لیتا۔ میں سوچتا اس سے تو بہتر تھا کہ میں اپنے بہن بھائیوں سے رشتہ جوڑ لوں..... وہ لوگ سٹیٹس میں مجھ سے بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ مجھے اب ان کی

کربل کربل باتوں سے گھن آتی تھی۔ پھر مجھے یہ خدشہ ستاتا کہ وہ لوگ میرے پیسے اور سٹیٹس سے تو رشتہ جوڑ لیں گے، لیکن مجھے شاید تروتازہ نہ کر پائیں۔ دائم المریض شاہد بھائی ابا اماں کے بعد ٹمپل روڈ والے گھر پر ہی رہ گئے تھے۔ ابھی تک ہال روڈ کی چھوٹی سی دوکان کے مالک تھے، لیکن ان کا طرز زندگی ایسا تھا جس میں دیمک جیسی چھوٹی بڑی مصیبتیں جنم لیتی رہتی تھیں۔ بچوں کی تعلیم کے مسئلے، گھر والی کے خرچے کے مسائل، یوٹیلیٹی بلز کی ادائیگی کا رنڈی رونا..... وہ گھر اس قدر معاشی بدحالی کا شکار تھا کہ مجھے وہاں جا کر احساس جرم ہونے لگتا۔ شاہد بھائی یا تو دمے کے اٹیک میں داخل ہوتے یا داخل ہونے والے ہوتے۔ ان کا سانس اکھڑا دیکھ کر مناسب بات بھی نہ ہو سکتی۔ ویسے بھی طبقاتی اونچ نیچ گفتگو میں رکاوٹیں پیدا کر دیتی ہے۔ جب کبھی میں وہاں جاتا، جیب بھاری کر لیتا..... واپسی پر مجھے لگتا جیسے ٹمپل روڈ میں مجھے آنسوؤں بھرے دہشت گردوں نے لوٹ لیا.....

رفعت آپیا کراچی رہتی تھی۔ کبھی کبھی عید پر ملاقات ہو جاتی تو مجھے اس کے بچوں کے نام بھی ٹھیک سے نہ آتے..... فریدہ اور ظفر دونوں جرمنی میں تھے..... ان تارکین وطن کی اصل کہانی سے کوئی واقف نہ تھا۔ شاہد کی بیوی ان کی باتیں کیا کرتی تھی، لیکن میں نے کبھی ان دونوں کا سراغ لگانے کی کوشش نہ کی..... ابا، اماں نے گھر سے رخصت ہوتے ہی ہم سب کو آزاد کر دیا تھا۔ میں ایک کمفرٹیبل زندگی کو مسائل کے حوالے نہ کرنا چاہتا تھا۔ مجھے اطلاع اور انتظار دونوں سے خوف آیا تھا۔ پھر بھی میں صبح و شام اچھے دنوں کا انتظار ہی کیے جاتا۔ گویا یہی زندگی کا اصل مفہوم ہو۔

عجیب سی بات ہے لیکن عارفین مجھے انتظار کروائے بغیر کبھی نہ آیا۔ کچھ دیر غصے کی حالت میں ٹہلنے کے بعد میں مکمل طور پر اضمحلال اور شکست میں بدل جاتا۔ خود ترسی کا شکار، اپنی حالت زار پر دل شکستہ اس کے آنے تک میں مکمل طور پر پسپا ہو جاتا۔

وہ گاڑی سے اترتے ہی بڑے زور و شور سے آئی ایم سوری آئی ایم ویری سوری کے

نعرے لگاتا۔اس کی کھلی کھلی مسکراہٹ، صاف اجلے کپڑے،شوشائین والے بوٹ دیکھ کرمیری تھکاوٹ کم ہونے لگتی اور میں آئی ایم سوری پر اکتفا کر کے اس کے ساتھ ساتھ اندر کی طرف چل پڑتا۔

عارفین نے ہمیشہ وعدے توڑے۔اس کے نزدیک ہر نیا وعدہ پچھلے وعدے کی توسیع تھا۔اول تو وہ پیسے لے کر کبھی واپس نہ کرتا اور اگر کبھی اس نے رقم واپس بھی کی تو قسطوں میں..... گویا رہٹی چلا دی۔ہمیشہ پوری رقم لیتا اور کبھی سالم ادا نہ کرتا۔میرے ہر پروگرام میں مجھ سے پہلے شریک ہوتا،لیکن جونہی سیر وتفریح کا کوئی پروگرام وہ اپنی فیملی یا کسی دوست کے ساتھ علیحدہ طے کرتا،فوراً میرا پتہ کاٹ کر ان کے ساتھ شامل ہو جاتا۔مجھے ان تفریحات کی تفاصیل ہمیشہ بعد میں البم کی تصویروں کی طرح الٹ پلٹ کر دکھایا کرتا۔اس کا خاندان، دوست، شکار، اخبار بینی، کتب بینی کے مشاغل میں میرا کوئی گزر نہ تھا.....

میں ڈیفنس کی چار کنال کوٹھی میں صرف عارفین کے انتظار کی رسی سے بندھا کتا تھا۔میں نے نہ تو بھاگ جانے کی سوچی، نہ عارفین کو چھوڑ دینے کا خیال ہی کبھی مجھے آیا۔

میں نے اس کے سامنے ہمیشہ ہار مانی.....

وہ طاقتور فاتح سکندر تھا۔بگ باس،سر جی! فیصلے صادر کرنے پر قادر۔اس نے اپنے کسی رویے سے اپنے عمل کی Explanation کبھی نہ دی۔میں اگر کسی معاملے میں ذرا سا بھی قصوروار ٹھہرتا تو ادنیٰ چپڑاسی، کلرک، خانساماں کی طرح جواز پیش کرنے لگتا۔غلط ہو کر بھی اس کی گفتگو الزامی ہوتی۔درست ہوتے ہوئے بھی میری باتوں پر اس کا غصہ جائز لگتا۔وہ بھڑکتا..... ''تم جیسے کلرکوں کو چھڑکیاں ہی کھانا پڑتی ہیں اور شوکاز نوٹس بھی کبھی کبھی ہاتھ میں آجاتا ہے..... تمہاری پرسنیلٹی اتنی دولت کے باوجود دبو ہے۔یہ سارا تمہاری پینڈو بیک گراؤنڈ کی وجہ سے ہے''۔

''آئی ایم سوری یار'' میں کہے جاتا۔

لیکن بگ باس کبھی میری ''سوری'' کو قبول نہ کرتا اور جھڑکتا چلا جاتا۔

کوٹھی بہت بڑی تھی۔ میرا رول اس کوٹھی میں رکھوالے کا تھا..... بھونکتے رہنا، چوکیداری کرنا، رانگ نمبر کے فون سننا، دروازے کنڈیاں بند کرنا کھولنا، ارجمند اور جہانگیر کے فون کے انتظار میں رہنا..... دھوبی، دودھ والے، اخبار کے ہاکر سے دوستی کرنا، کوٹھی سے نکل کر گیٹ پر کھڑے ہو کر آتے جاتے لوگوں کو سلام کرنا، غریبوں کو خیرات دینا، کوے چیلوں کو صدقے کا گوشت پھینکنا، لان میں مالی کو شرمندہ کرنے کے لئے جڑی بوٹی نکالنا..... میں نیا پنے لئے کچھ چھوٹی چھوٹی اذیتیں ایجاد کر لی تھیں، کیونکہ ان اذیتوں کے علاوہ میرا کوئی مصرف نہ تھا..... باقی بچے ہوئے وقت کو میں نے عارفین کے انتظار اور اقبال کی یاد کے حوالے کر دیا تھا۔ پھر اچانک ایک واقعہ ہو گیا۔

اس دن عارفین بڑے سادہ سے شلوار قمیض میں آیا، اس کی نمک مرچ داڑھی بھی بڑھی ہوئی تھی اور یوں لگتا تھا گویا وہ رویا سا ہے۔ میں عارفین کا انتظار بھی نہیں کر رہا تھا کہ وہ اچانک وارد ہو گیا..... یہ بھی عجیب بات ہوئی۔

ہم دونوں آگے پیچھے اندر کی طرف چل دیئے۔

''سیر کو چلیں، موسم اچھا ہے.....''

''نہیں یار یہیں..... ٹھیک ہے''۔

ہم دونوں شطرنج والی میز کے گرد بیٹھ گئے۔ میں نے میز کے ساتھ لگی ہوئی گھنٹی بجائی..... مودب، چالاک غلام نبی آ گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس شام وہ اس معمولی سروس کے بدلے مجھ سے ادھار مانگے گا یا چھٹی۔

''کافی لائے کریم کے ساتھ''

''ناں ناں جی نہیں چاہتا.....''

''ناں.....''

''چلو چائے لاؤ''

غلام نبی برخاست ہو گیا.....

ہم نے شطرنج پر مہرے جمائے۔ دو چالیں چلنے کے بعد عارفین نے کہا..... ''بش یار جی نہیں کرتا.....''

''تاش نکالو.....''

''ناں یار..... دو آدمیوں میں..... فلاش کھیل کر مزہ نہیں آتا.....''

''تو پھر تیسرے آدمی کی تو چوائس ہی میرے پاس نہیں ہے''

عارفین دونوں گھٹنے کھول کر ان پر ہاتھ جمائے بیٹھا تھا۔ پھر کہیں سے مغرب کی اذان سنائی دی۔ وہ سیدھا غسل خانے میں چلا گیا، میں نے باورچی خانے کا رخ کیا اور اس کی پسند کی کافی بنا کر لوٹا تو وہ سر پر رومال باندھے ایک کونے میں سامنے کشن رکھ کر نماز پڑھنے میں مشغول تھا۔ چند لمحے میں نے اس کی کمر کو گھورا تو مجھے یوں لگا جیسے وہ رو رہا ہو۔ جب تک وہ مغرب کی نماز پڑھ کر اٹھا، کریم ملی کافی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ وہ سر سے رومال اتارتا ہوا کچھ کتایا سا آ کر صوفے میں دھنس گیا۔

''بھائی صاحب تم نے تو کافی برف کر دی۔ مجھے بتا دیتے میں کافی نہ بناتا''

''ٹھیک ہے..... چلے گی'' اس نے پیالی اٹھالی۔

یہ میرے لئے عجیب سی بات تھی، کیونکہ عارفین کھانے پینے کے معاملے میں بہت نازک مزاج تھا۔ گرم چائے، البتی کافی ..... درست نمک مرچ، اچھی بھنائی والا گوشت، خستہ چیزیں، لذیز کھانا بروقت حاضر نہ ہوتا تو وہ چڑچڑا سا ہو جاتا۔ اچانک کھاتے کھاتے وہ کہتا۔ ''یار! اس غلام نبی کو نکال دو۔ یہ ہلدی کچی رکھتا ہے۔'' میرے لئے یہ علم بالکل نیا تھا کہ ہلدی بھی کچی رہ سکتی ہے، اسے بکرے کے تمام اعضاء کا ایسے علم تھا جیسے میڈیکل کے طالب علم کو گرے کی کتاب سے علم الابدان حاصل ہوا کرتا